مذہبی اقلیتوں کی سیاسی نمائندگی کس طرح موثر ہوسکتی ہے؟

تحریر: پیٹر جیکب

22 سال پر محیط ایک زمانہ تھا ملک میں انتخاب جداگانہ تھا اس دوران پانچ عام اور تین بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ ملک کے سیاسی نظام میں مذہبی لحاظ سے تقسیم پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہوئی۔ جداگانہ انتخابات میں مذہب کی بنیاد پر انتخابی فہرستیں (جو کبھی مکمل نہیں ہوتی تھیں)، نشستیں، حلقے سب کچھ حتی کہ پولنگ بوتھ اور قطاریں بھی الگ ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی انتخابی مہمیں اور تانگہ پارٹیاں بھی الگ الگ ہوتی تھیں۔ قومی اسمبلی کی ایک اقلیتی نشست کے لئے حلقہ پورا پاکستان اور صوبائی اسمبلی کی ممبری کے لئے پورے کا پورا صوبہ۔ جس میں خاص طور پر مسیحی برادری کے ارکان کثیر تعداد میں حصہ لیتے رہے۔ چند ایک انتخاب جیت کر یا دوسرے لفظوں میں ملکی سیاسی کلچر کا حصہ بن کر مالی آسودگی حاصل کرتے تو انتخاب لڑنے والوں کی اکثریت معاشی بدحالی کی منزلیں طے کرتی ہوئی گمنامی سے دوچار ہوجاتی تھی۔

مذہبی اقلیتوں کے بیلٹ پیپر کی طوالت شبِ جدائی کو مات دیتی تھی۔ ووٹر بیلٹ پیپر کو فرش پر پھیلا کر، تادیر مطالعہ کے بعد اپنے پسندیدہ امیدوار کا کھوج لگاتے اور مہرِ توثیق ثبت کرتے تھے۔ اقلیتی انتخابی نتائج دیگر نتائج سے کہیں زیادہ تجسس کے حامل ہوتے تھے۔ ان کے آنے میں کبھی دن تو کبھی ہفتے لگتے تھے۔ کیونکہ یہ امیدوار کی مقبولیت تو کم لیکن مالی حیثیت کا امتحان زیادہ ہوتا تھا۔ معاف کیجئے صرف مالی حیثیت کا نہیں بلکہ بریف کیس تیار رکھنے اور الیکشن کمیشن سے معاملات طے کرنے کا بھی امتحان۔ کیونکہ آہستہ آہستہ یہ سب چیزیں عوامی نمائندہ بننے کی اہلیت میں شامل ہوچکی تھیں۔ اسی تکنیکی خرابی کے باعث کئی جیتنے والے افراد الیکشن ٹرابیونل اور عدالتوں کے چکر لگا کر اپنی ''واقفیت عامہ'' میں اضافہ کرتے تو ہارے ہوئے لیکن بااثر لوگ اسمبلیوں میں اقلیتوں کی نمائندگی کے فرائض بارہا سرانجام دیتے پائے گئے۔

ملک کی دو بڑی مذہبی اقلیتوں (ہندو اور مسیحی) کے ووٹرز اپنے نمائندوں سے زندگی بھر ملنے کو ترستے تھے۔ دوسری طرف بے چارے نمائندے قانون سازی کے عمل میں بالکل غیر مؤثر ہوتے تھے۔ پانچ اسمبلیوں میں جن کے یہ ممبر رہے نہ کسی عوام دشمن قانون سازی کو رُکوایا نہ ازخود کوئی قانون پاس کروا سکے۔ اس کارکردگی کی وجہ انفرادی نااہلی سے بڑھ کر وہ سیاسی نظام تھا، اور جداگانہ طرزِ سیاست تھی جس کا وہ نمائندے حصہ تھے۔ جداگانہ طرزِ انتخاب ضیاء الحق کے دور میں اسلام کے نام پر بنائے گئے سخت گیر قوانین کے ساتھ آیا (1979) جو ایک آمر کے مذہبی ریاست اور جنونی معاشرہ بنانے کے ایجنڈا کا حصہ تھا۔ بے شک مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسیحی برادری کے کچھ سرکردہ افراد کو یہ گمان تھا کہ اس سے ان کی شناخت اور حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔

جداگانہ طرزِ انتخاب کے خلاف رائے عامہ آہستہ آہستہ بیدار ہوئی۔ 1993 میں آئین کے آرٹیکل 106 میں ابہام کو بنیاد بنا کر سول سوسائٹی کے حلقوں نے لاہور سے چوہدری نعیم شاکر ایڈووکیٹ اور کراچی سے سلیم کھوکھر کے کاغذاتِ نامزدگی جمع کروائے۔ جس کا مقصد جداگانہ انتخابات کے تصوّر کو چیلنج کرنا تھا۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے پہلے تو کاغذاتِ نامزدگی قبول کروائے لیکن بعد میں اسٹیبلشمنٹ کے ایما پر ان نشستوں پر الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی انتخاب کے موقع پر کمیشن برائے امن وانصاف (MSLCP ملتان) کی جانب سے پہلی مرتبہ جداگانہ انتخاب کے بائیکاٹ کی کال دی گئی۔ البتہ بائیکاٹ کو بڑے پیمانے پر کامیابی 1999-2000 کے بلدیاتی انتخابات کے دوران ملی جب یہ کال ایک بڑے الحاق کی طرف سے دی گئی۔ یہاں تک آتے جداگانہ انتخابات کے منفی اثرات کا لوگوں کو بھی بخوبی تجربہ ہوچکا تھا۔ بائیکاٹ سے پہلے مخلوط ومساوی حقوق کی مہم میں مسیحی اور ہندو برادریوں کی سرکردہ تنظیموں نے وسیع تر الحاق بنائے اور رائے عامہ بیدار کرنے کی ملک گیر سرگرمیوں کا انعقاد کیا۔ نیز مخلوط انتخابات کے کیس کو مضبوط کرنے میں اقتصادی وسماجی کونسل (ایکوسوک) قرارداد نمبر 1503 کے تحت اقوام متحدہ کے دفتر برائے انسانی حقوق (جنیوا) میں درخواست دائر کی جس کا اس بحالی میں اچھا خاصا کردار بھی تھا۔

لہذا مشرف حکومت کے تحت پانچ مرحلوں میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات کے جداگانہ عنصر کو بھی مرحلہ وار ختم یا کم کردیا گیا۔ یوں جنوری 2002 میں مشرف حکومت کے اولین تھنک ٹینک جنرل نقوی کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آئندہ عام انتخابات مخلوط طرز پر ہوں گے۔ کچھ دیر بعد یہ اعلان بھی ہوگیا کہ مذہبی اقلیتوں کے لئے مخصوص نشستیں برقرار رہیں گی اور یہ متناسب نمائندگی کے طریقہ سے پُر کی جائیں گی۔ 2016 تک اس طریق پر تین عام انتخابات ہو چکے ہیں اور اقلیتی ووٹر نے قومی دھارے میں شامل ہونے کا ذائقہ بھی چکھ لیا ہے۔

مشرف حکومت اپنی کہہ مکرنیوں کے باوجود مخلوط انتخابات کی بحالی کا کریڈیٹ لینے کی کوشش کرتی رہی حالانکہ اس میں زیادہ تر حصہ تو مقامی طور پر چلائی گئی مہم اور سازگار بین الاقوامی رائے عامہ کا تھا علاوہ ازیں اس مطالبے کا اساسی اصول یعنی شہریوں کا بلا امتیاز بالغ رائے دہی کا حق اور حقِ نمائندگی اسکی منطقی طاقت تھا۔ مخلوط انتخابات کی بحالی اسقدر جائز اور درست اقدام تھا کہ جب پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے 2006 میں میثاقِ جمہوریت کی تدوین کی تو اس میں مذہبی اقلیتوں کے دیگر حقوق کے تحفظ کے ذکر کے ساتھ مخلوط انتخابات کو جاری رکھنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

قومی کمیشن برائے امن وانصاف کیونکہ اس مہم کی سربراہی کر رہا تھا جو دو سال تک جاری رہی اس لئے واضح کرنا ضروری ہے کہ مخصوص نشستوں کو جاری رکھنا اور انکا محض طریقۂ انتخاب بدلنا اس مہم کے مطالبات کا حصہ نہیں تھا۔ البتہ اسے بعد ازاں ایک عارضی انتظام کے طور پر قبول کیا گیا تا وقت کہ نظام ریاست اور قانون کو دیگر مذہبی امتیازات سے پاک کر لیا جائے لیکن اصولی مؤقف شہریوں کی بلا امتیاز و غیر مشروط برابری تھی جس پر الحاق کرنے والی تنظیمیں آج بھی قائم ہیں۔

آج کل ملک اور بیرون میں مقیم سیاست سے دلچسپی رکھنے والے کچھ مسیحی نیز دلت برادریوں (شیڈول کاسٹ ہندو) کے افراد نے دوہرے ووٹ اور براہِ راست نمائندگی کے بارے میں بات شروع کی ہے جس کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ موجودہ نمائندگان قومی وصوبائی اسمبلی اور اب سینٹ میں اقلیتی نمائندوں کو یہ کہہ کر تنقید کی جاتی ہے کہ یہ الیکشن نہیں سلیکشن کے ذریعے ایوانوں میں آئے ہیں۔ یہی تنقید اگرچہ ناسمجھوں کی طرف سے لیکن اس تجویز میں کچھ سیاستدانوں کو اپنا سیاسی مستقبل تابناک لگتا ہے۔ غور کیجئے عورتوں کے لئے بھی ایک بڑی تعداد میں نشستیں مخصوص کی گئی ہیں اور ان نشستوں پر نمائندگی کا معیار بھی ویسا ہی ہے جیسا اقلیتی نشستوں کے لئے۔ لیکن ان پر توقعات کا مینارِ پاکستان نہیں بنایا گیا۔ تو کسی سیانے نے یہ تجویز دی کہ عورتوں کی مخصوص نشستوں کے لئے طریقۂ کار تبدیل کر دیا جائے۔ اس لئے کہ سوال تو صنفی برابری لانے کا ہے۔ عورتوں مردوں کے درمیان خلیج کو گہرا کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ نا ہی انتخابی نظام کو غیر ضروری پیچیدگیوں سے دوچار کیا جانا چاہیے۔ خاص طور پر جب کہ جمہوریت نوزائیدہ اور مشکلات سے دوچار ہے۔ اور جب جمہوریت جو بن پر ہوگی تو کسی بھی بنیاد پر مخصوص نشستوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

الیکشن سلیکشن کی درفتنی میں ایک کشش تو تھی بحث کراری ہوئی۔ یہاں تک کہ کچھ اقلیتی نمائندوں نے بھی اس بات کو آگے بڑھانے میں عافیت سمجھی کیونکہ ان کو اپنی سستی اور نااہلی یا عمل کا جواب دینے کی بجائے ایک جواز سامل گیا۔ راقم کو ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ اقلیتی نمائندے بھی گذشتہ ادوار میں ترقیاتی فنڈز کا حساب عوام یا کسی معتبر فورم پر دینے سے دور بھاگتے تھے۔ لہذا طرزِ انتخاب کی بحث نے جتنا ان کو بدنام کیا اتنا ہی وقتی طور پر فائدہ بھی دے دیا۔

ایک رجحان یہ ہے کہ اصول اور قاعدے کی بات کرنے کی بجائے شخصیات کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔ طرزِ گفتگو منتخب لوگوں کی لعن طعن اور کردار کشی گہری تو جلتی بھُجتی تحریریں پڑھنے اور باتیں سننے کی عادت کی تسکین تو ہوئی مگر اس میں اقلیتی برادریوں کے تحفظ و بقاء کے لئے مربوط ایجنڈا نہیں بن سکتا۔
دیکھنے میں آیا ہے کہ چاہے قصور یا لاہور کا سانحہ ہو خواہ پانچ فی صد کوٹہ پاس ہو تنقید کی برچھی کبھی ایک تو کبھی دوسرے وزیر کے لئے تیار رہتی ہے جو کہ نامناسب رویہ ہے۔ ناقدین کی کوشش یہ ہے کہ موجودہ نظام اور شخصیات پر تنقید کے تاؤ پر دوہرے ووٹ کی روٹی پکالی جائے۔ ای میل اور انٹرنیٹ کی مار بہت زیادہ اور دور تک ہے اس کا حقائق کے برعکس اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کسی کے لئے اچھے بھی نتائج برآمد نہیں کر سکتا۔

آیئے جائزہ لیں کہ دوہرے ووٹ کی تجویز کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔

1۔ دُنیا کے سیاسی نظاموں میں مخصوص نشستوں اور متناسب نمائندگی کی تو کئی مثالیں ہیں لیکن دوہرے ووٹ کی صرف ایک مثال ہے اور وہ پاکستان کے کشمیری ووٹروں کی جو آزاد کشمیر سے باہر پاکستان کے دیگر شہروں میں آباد ہیں۔ وہ پاکستان کی اسمبلیوں اور آزاد کشمیر کی اسمبلی دونوں کے لئے ووٹ دے سکتے ہیں۔ کشمیریوں کی مثال اپنے لئے ماڈل بنانے سے پہلے مذہبی اقلیتوں کو عوامل اور نتائج کا جائزہ لے لینا چاہیئے۔ کشمیری پاکستان کے اندر ہی سیاسی طور پر عدم نمائندگی، ہجرت اور بے وقعتی کا شکار ہوئے، جان و مال کی قربانیاں اور اسلام آباد کی دھونس دھاندلی الگ ہیں۔ کسی معمولی فائدے کے لئے برابر شہری حقوق سے دستبرداری کوئی عقلمندی نہ ہوگی۔

2۔ دوہرے ووٹ کی وکالت میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی طرف سے 1996 میں مذہبی اقلیتوں کے لئے دوہرے ووٹ کی تجویز دی گئی تھی۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اس وقت رائج جداگانہ انتخابات کے رائے عامہ کی تیاری کے علاوہ اس بیان کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ پیپلز پارٹی نے اس کے بعد اس تجویز کو نہ تو دہرایا نہ ہی اس پر کوئی کام کیا گیا یقیناً محترمہ کے اس بیان کا مقصد صرف متبادل پر توجہ دلانا تھا۔ مخلوط اور مساوی حقوق کے لئے راستہ نکالنا تھا۔

3۔ اگر باقی شہریوں کو چھوڑ کر صرف مذہبی اقلیتوں کو دوہرا ووٹ ملے تو یہ رعایت ہوگی حق نہیں۔ حقوق برابری لانے یا معاشرے میں موجود معاشی، معاشرتی ناہمواری کو دور کرنے کا باعث بنتے ہیں جبکہ مراعات (رعایتیں) نابرابری (اونچ نیچ) پیدا کرتی ہیں اور اونچ نیچ کا اثر پھر ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتا۔ دوسری جانب بیشتر معاشروں میں سماجی امتیازات پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ قانون اور نظامِ ریاست ان امتیازات کی حوصلہ شکنی کا کام کرتے ہیں لیکن اگر ان کو سیاسی قانونی نظام کا حصہ بنا دیا جائے تو انہیں دوام اور توثیق مل جاتی ہے۔

4۔ دوہرے ووٹ کی تجویز میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے عملاً جداگانہ طرزِ انتخاب واپس آجائے گا جو معکوس یعنی پیچھے کی طرف سفر ہوگا۔ مخلوط انتخابات کی بحالی کے بعد کا لائحہ عمل تو یہ تھا کہ قانون میں موجودہ باقی امتیازات کے خاتمے کے لئے کام کیا جائے تاکہ سیاسی / معاشرتی سدھار کی صورت پیدا ہو۔ دوہرے ووٹ کے تجویز کنندگان نے ہر مسئلہ کا علاج اقلیتی نمائندگی میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جو حقیقت پسندانہ عمل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجویز (دوہرا ووٹ) سے شاید چند گھرانوں کو منافع جبکہ لاکھوں اقلیتی ووٹرز کو خسارہ ہوگا۔ حلقہ کے نمائندہ قومی وصوبائی اسمبلی جو آج اقلیتی ووٹرز کو اہمیت دینا شروع کر چکے ہیں۔ روزگار، کاغذات کی تصدیق اور تھانہ سے متعلق وغیرہ کے روزمرّہ کے مسائل کے لئے اقلیتی ووٹرز کو ''اپنے'' نمائندوں کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے۔ پھر وسیع حلقے کے سبب کام کا بوجھ اتنا ہوگا کہ اقلیتی نمائندہ کسی کی خاطر خواہ مدد نہ کر پائیں گے۔

5۔ دوہرے ووٹ کے حامی یہ بھی کہتے ہیں کہ لاگو نظام میں اقلیتی اُمیدواروں کو خطیر رقم پارٹی فنڈ کے طور پر جمع کروانی پڑتی ہے۔ یہ باوجود کہ بہت اچھی روایت نہیں اور اس سے سیاست میں سرمائے کے عمل دخل کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن یہ بلا امتیاز ہے۔ پارٹی فنڈ تو مسلم، یا غیر مسلم اُمیدوار سبھی کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ نیز جداگانہ طرزِ انتخاب میں تو اس سے کہیں زیادہ رقوم خرچ ہوتی ہیں۔

6۔ ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ شاید جداگانہ انتخاب کے ذریعے منتخب ہو کر اقلیتوں کے نمائندے بننے والے لوگوں کی وقعت زیادہ ہوتی تھی۔ اس دعوے کے حق میں کوئی ثبوت اور تجزیہ پیش نہیں کیا گیا۔ اس لئے اس پر زیادہ بحث نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ جُداگانہ انتخابات کے دَور کے نمائندوں کی کارکردگی یہ کہاں ثابت کرتی ہے کہ وہ براہِ راست ووٹ لینے کے باعث تگڑے نمائندے ثابت ہوئے۔
حالات البتہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ صورتِ حال کا ازسرِ نو جائزہ لے کر سیاسی، سماجی میدان کے کھلاڑی برادریوں کو متحرک کر کے قومی سطح کے مسائل کے حل کے لئے تگ ودَو میں شامل کیا جائے۔ چونکہ یہ بات طے ہے کہ اقلیتی برادریوں اور پاکستان کی ترقی وخوشحالی ایک دوسرے پر منحصر اور مشروط ہے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشاہدات اور تجاویز پیشِ خدمت ہیں:۔

1۔ مخلوط انتخابات سے اقلیتی ووٹرز کا وقار بحیثیت شہری بحال ہوا اس کے خاتمے یا تحلیل کی ہر تجویز غیر جمہوری اور غیر منطقی ہے۔ نیز مخصوص نشستوں کی موجودگی، ان کے حالیہ اضافے نیز سینیٹ میں نمائندگی کے ساتھ سیاسی نمائندگی کے تقاضے پورے اور مکمل ہو جاتے ہیں۔ اب وقت یہ ہے کہ سیاسی نمائندگی سے نکل کر ملک کے قانونی اور خصوصاً تعلیمی نظام کی اصلاحات پر توجہ دی جائے اور ہمارے مطالبات کا مرکز معاشی وسماجی انصاف ہو۔ ملازمتوں اور داخلوں کے لئے کوٹہ کا عملی اطلاق کروایا جائے۔

2۔ بجائے کہ ہر کَس ایم این اے، ایم پی اے و ناکَس تانگہ پارٹی بنائے اقلیتی سیاست دانوں اور پارلیمنٹیرینز کا ملک کی بڑی جماعتوں کے اندر رہ کر کام کرنا مناسب ہے۔ اس سے ان کے حلقۂ اثر میں اضافہ ہوتا ہے البتہ تاثیر پیدا کرنا شرط ہے۔ اس ضمن میں تجویز یہ ہے کہ پارٹیاں اپنے اندر انتخابات کی روایت کو جمہوری بناتے ہوئے قومی وصوبائی اسمبلیوں کے لئے خواتین اور اقلیتوں کے لئے اپنے اپنے اُمیدواروں کا انتخاب پارٹی کے اندر ووٹ کے ذریعے کریں جو عام انتخابات سے چند مہینے یا ایک سال پہلے کیا جائے۔ اس سے پارٹی کے اندر جمہوریت اور حقیقی نمائندگی کے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ سیاست میں کالے دھَن اور کرپشن کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔

3۔ بلدیات کے لئے یونین کونسل اور ضلع کی سطح پر مخصوص مزدوروں، کسانوں، خواتین، نوجوانوں اور مذہبی اقلیتوں کی نشستوں پر منتخب ممبران کو بااختیار بنایا جائے۔
دوہرے ووٹ کی تجویز دینے والے وہ جواب یاد رکھیں جو پنجاب میں چوپڑی اور دو دو مانگنے والے کو ملتا ہے۔ دوہرے ووٹ کی تجویز کا براہِ راست مطلب سیاسی نظام میں مذہب کی بنیاد پر تقسیم اور مذہب کے سیاسی استعمال کو دوام بخشنا ہے۔ وقت کی آنکھ کا اشارہ کچھ اور ہے۔ باشعور لوگ جانتے ہیں کہ وقت، پاکستان کو راہِ راست اور راہِ نجات کی طرف لے آیا تھا۔ اب اس سے آگے ایک جمہوری پاکستان ناگزیر ہے۔ جمہوریت شہریوں کی بلاتفریق آزادیوں اور مساوات کے بغیر قائم نہیں ہوتی۔

مذہبی یا سیاسی نمائندگی

بسا اوقات پاکستان کی سیاست میں مذہب کو بُری طرح استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اور اگر ایک مذہبی گروہ یا مذہب کے پیروکاروں کا ایسا کرنا غلط ہے۔ تو دوسرے تیسرے کی طرف سے بھی یہ اقدام ناخوشگوار نتائج برآمد کرے گا۔
مخصوص اقلیتی نشستوں کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اقلیتی برادریوں کی سیاسی نمائندگی کا بندوبست ہے نہ کہ مذہبی نمائندگی کا۔ اور سیاسی نمائندگی درختوں پر نہیں اُگتی اور نہ ہی اوپر سے ٹپکنے والی نمائندگی اچھے اثرات رکھتی ہے۔ نمائندوں کی تربیت ایوانوں کی بجائے سماجی سیاسی عوامل میں ہوتی ہے، تنظیم میں ہوتی ہے۔ ایوان تک پہنچنے سے محض سیاسی قیادت یا صلاحیت تسلیم ہوتی ہے۔

سیاسی تنظیم جتنی بڑی ہوگی اس کا اثر ونفوذ بھی اتنا بڑا ہوگا۔ پاکستان میں تا حال صرف مذہبی اقلیتوں کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن ملک کے اندر لسانی، نسلی اور دیگر اقلیتوں کو بھی قانون کا تحفظ اور نمائندگی چاہیے۔ مزدور و کسانوں کو بھی نمائندگی چاہیے۔ اس لئے اگر ان سب کے لئے کوئی انتظام ہو تو اسے وسیع مُلکی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اصول یا نظام وہی اچھا ہوتا ہے جو معاشرے میں موجود افراد کو نظر انداز نہ کرے۔ بلکہ دُنیا بھر میں ایوان اسی تگ و دَو میں ہیں کہ نمائندگی کے دائرے کو بڑھایا جائے۔ حتیٰ کہ تارکینِ وطن کی نمائندگی کو خاص توجہ دی جارہی ہے۔ مگر وہ سیاسی جماعتوں میں کام کرتے ہیں۔ برطانیہ، ناروے، فرانس کے مسلمان نمائندے مذہبی نمائندے نہیں ہوتے۔ ہاں مگر مذہب اپنا اپنا۔

کوٹہ اور جداگانہ انتخابات

بعض دفعہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر قومی دھارے میں شامل رہنا اور میرٹ کا اصول اتنا ہی عزیز ہے تو پھر ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے لئے کوٹہ کا مطالبہ اور حمایت کیوں کر جائز ہے۔ جواب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں پسماندگی و علیحدگی کو ختم کرنا ان سے نمٹنا ہے۔ یعنی ایک ہی مقصد کو پانے کے دو طریقہ ہائے کار ہیں اور دُنیا بھر میں زیرِ استعمال ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک کا تعلق معاشی حقوق سے ہے اور دوسرے کا سیاسی نمائندگی سے ہے۔ سیاسی خیالات اور وفاداریاں تبدیل ہوتی ہیں تو لازم نہیں کہ اس کا اثر معاشی نظام یا معاشی حقائق پر پڑے لیکن معاشی حیثیت فرد کی ہو یا قوم کی، اس کے تبدیل ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اس لئے ریاست اور قانون میں اگر محروم طبقات کے لئے تحفظ اور خصوصی انتظامات نہ ہوں تو عوام کی سطح پر دیگر حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں۔

لہذا کوٹہ اور جُداگانہ نمائندگی ایک دوسرے کی ضد نہیں یعنی ان میں کوئی اصولی ٹکراؤ نہیں پایا جاتا۔ نہ ہی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم۔ البتہ یہ بات تاریخ سے ثابت کی جاسکتی ہے کہ جُداگانہ سیاسی نمائندگی علیحدگی بلکہ علیحدگی پسندی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ پسماندہ طبقات کے لئے معاشی حقوق کا تحفظ قوموں کو مضبوط کرتا اور یکجہتی کی طرف لے جاتا ہے۔

اقلیّت یا نہیں؟ ایک وضاحت

بعض مرتبہ کچھ لوگ لفظ اقلیّت کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کی خواہش غالباً یہ ہوتی ہے کہ شہریوں میں نابرابری ختم ہوجائے۔ یہ خواہش بلاشبہ قابلِ احترام ہے۔ مگر یہ اصطلاح ایک سماجی حقیقت (اعداد) کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس حقیقت کی تشکیل پہلے سے آئین، قوانین اور سماجی عوامل کے ہاتھوں ہوچکی اس لئے اس اصطلاح کو استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ اگر نابرابری کو ختم کرنا ہے تو یہ جاننا بھی ضروری ہوگا کہ نابرابری کہاں کہاں اور کیسے پائی جاتی ہے۔ لہٰذا پاکستان میں مذہبی اور دیگر اقلیتوں کو کھلے دل سے زیرِ بحث لانا نیز اُن کی شناخت اور حقیقی حیثیت کو تسلیم کرنا مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے۔

آواز
VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME
ASSOCIATION OF WOMEN FOR AWARENESS & MOTIVATION
AWAM
UKaid
from the British people